ازلی ذبیح اللہ

مصنف

انور صدیق

ازلی ذبیح اللہ

مصنف

انور صدیق

انور صدیق سنٹر، مری روڈ، راولپنڈی

ایک گزارش

معزز قارئین!

اس کتابچہ کی اشاعت سے قصداً کسی کی دلآزاری مقصود نہیں الفاظ کے استعمال میں خصوصی احتیاط برتی گئی ہے۔

تاہم اردو یا عربی میں اگر کوئی نادانستہ غلطی ہو تو معذرت خواہ ہیں۔ ایسی غلطیاں Human Element سے ہو سکتی ہے دیدہ دانستہ نہیں۔

بعض غلطیاں دل سے ہوتی ہیں بعض دماغ سے۔ دل کی غلطی دانستہ کی جاتی ہے دماغ کی غلطی سہواً یا بھول چوک سے سرزد ہو جاتی ہے۔ اسے انسانی عنصر سمجھ کر نظرانداز فرما دیں۔

کھلے دِل اور بلند نظری سے پڑھیں خُدا آپ کو برکت دے گا۔

جناب مبشر انور صدیق صاحب ایک عظیم فلاسفر اور واعظ تھے۔
اُن کی تحریر اور تقریر نہایت عالمانہ رہی۔
الفاظ اُن کے سامنے قطار بنائے ادب سے کھڑے رہتے تھے
کلام مقدس کی تفسیر میں یکتا تھے۔
آپ یکم اپریل ۲۰۰۱ کو خُداوند میں سو گئے۔
؎ خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
اُن کے ہاتھ سے تحریر کردہ کچھ صفحات محفوظ تھے۔
جو پیشِ خدمت ہیں۔
خُدا کرے اس کے مطالعہ سے آپ کے ایمان کو پختگی اور قلب کو
وسعت میسر آئے۔

(آمین)

پیش لفظ

فرقہ وارانہ تشدد (Sectarian Killings) سے وطنِ عزیز پاکستان کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے بین الاقوامی طور پر ہماری بہت بدنامی ہوئی ہے۔ یہ لوگ پاکستان اور پاکستانی قوم کے دوست نہیں ہو سکتے۔ خُدا انہیں معاف کرے۔

یہ کتابچہ اُلجھے ہوئے مسائل کو علمی اور عقلی طور پر سمجھنے کی کوشش ہے۔

آیئے Bridges of Understandig تعمیر کریں ایک دوسرے کے قریب آئیں ،ایک دوسرے کا ہاتھ تھامیں، بھائیوں کی طرح بیٹھ کر باہمی رواداری اور امن پسندی سے بحث اور سوچ بچار کریں۔ جہاں اختلاف ہے وہاں عقلی دلیل پیش کریں۔اس طرح خداوند کا رُوحِ اقدس ہم سب کے دلوں کو منور کر دے گا۔

تشدد سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ مزید بگڑ تے ہیں۔ جہاں عقل کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے تشدد کا آغاز ہوتا ہے جو عقلوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

خُدا ہماری عقل اور قلب کو روشن کرے، خُدا اپنا رُخِ روشن ہم سب پر ظاہر فرمائے۔خُدا آپ کو برکت دے اور محفوظ رکھے۔

Peace be unto you

ازلی ذبیح اللہ

دیکھو خدا کا برّہ جو دنیا کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے (یوحنا ۱:۲۹)

موسوی شریعت کے سلسلہ کے آخری نبی یوحنا (لِاَنَّ جَمِیْعَ الْاَنْبِیَاءِ وَ النَّامُوْسَ اِلٰی یُوْحَنَّا تَنَبَّاؤُا سب انبیا اور توریت نے یوحنا تک نبوت کی۔ متی ۱۱:۱۳) نے کشفِ الٰہی اور روح کی ہدایت سے مسیح کی شخصیت کے مابہ الامتیاز اوصاف وکمالات کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا "دیکھو خدا کا برّہ جو دنیا کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے" (یوحنا ۱:۲۹)

اسی ضمن میں جب ابوسعید ابوالخیر اس عالمِ ہیولانی (اجسام وصورت) کے ظاہری حسن وجمال اور اسکی ہر چیز پر جلوہءِ حق کو دیکھتا ہے پھر اس کی نگاہ اشیاء کے ہبوط وزوال اور انکے فنا کے احاطہء اختیار میں جانے پر پڑتی ہے تو کہتا ہے۔

اے آئینہء ذات تو ذاتِ ہمہ کس
مراۃء صرفات (صفات) تو صفات ہمہ کس
ضامن شدم از بہر نجات ہمہ کس
برمن بہ نویس سیّئات ہمہ کس

یعنی عالمِ حدوث مثل آئینہ کے ذات الٰہی کا ترجمان ہے اور اس سے اسکی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ میں ان میں سے ہر ایک کی نجات کا ضامن ہوتا ہوں۔ اے باری تعالیٰ تو مجھ پر تمام جہانوں کی بدکاریوں کو لکھ لے اور جو سزا تو انہیں دینا چاہتا ہے وہ سزا مجھے دے دے لیکن تو مراۃ صفات کو اور موجودات کے حسن وجمال کو تباہ نہ کر۔

اس انوکھے اندازِ فکر کی تمام تر خوبیاں یوحنا نبی (یحییٰ) کی نشاندہی میں نظر آتی ہیں جب یوحنا نے یسوع کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا هُوَ ذَا حَمَلُ اللّٰهِ الَّذِی يَرْفَعُ خَطِيَّةَ الْعَالَمِ

یعنی دیکھو یہ خدا کا برّہ ہے جو دُنیا کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے۔ یوحنا ۱:۲۹

اس لطیف نکتہ میں کلمتہ اللہ کی آمد کا مقصد انتہائی ارفع انداز میں بیان کیا ہے جسکی تفصیل یسعیاہ نبی نے ۵۳ باب آیت ۴ تا ۱۲ میں یوں بیان کی ہے۔

"تو بھی اس نے ہماری مشقتیں اُٹھا لیں اور ہمارے غموں کو برداشت کیا۔ پر ہم نے اسے خدا کا مارا کوٹا اور ستایا ہوا سمجھا۔ حالانکہ وہ ہماری خطاؤں کے سبب سے گھائل کیا گیا اور ہماری بدکرداری کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اس پر سیاست ہوئی تا کہ اس کے مار کھانے سے ہم شفا پائیں۔ ہم سب بھیڑوں کی مانند بھٹک گئے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی راہ کو پھرا پر خداوند نے ہم سب کی بدکرداری اس پر لادی۔

وہ ستایا گیا تو بھی اس نے برداشت کی اور منہ نہ کھولا جس طرح برّہ جسے ذبح کرنے کو لے جاتے ہیں اور جس طرح بھیڑ اپنے بال کترنے والوں کے سامنے بے زبان ہے اسی طرح وہ خاموش رہا۔ وہ ظلم کر کے اور فتویٰ لگا کر اسے لے گئے پر اس کے زمانہ کے لوگوں میں سے کس نے خیال کیا کہ وہ زندوں کی زمین سے کاٹ ڈالا گیا؟ میرے لوگوں کی خطاؤں کے سبب سے اس پر مار پڑی اس کی قبر بھی شریروں کے درمیان ٹھہرائی گئی اور وہ اپنی موت میں دولت مندوں کے ساتھ ہوا حالانکہ اس نے کسی طرح کا ظلم نہ کیا اور اس کے منہ میں ہرگز چھل نہ تھا لیکن خداوند کو پسند آیا کہ اسے کچلے۔ اس نے اسے غمگین کیا۔ جب اس کی جان گناہ کی قربانی کے لئے گذرانی جائے گی تو وہ اپنی نسل کو دیکھے گا۔ اس کی عمر دراز ہوگی اور خداوند کی مرضی اس کے ہاتھ کے وسیلہ سے پوری ہوگی۔ اپنی جان ہی کا دکھ اٹھا کر وہ اسے دیکھے گا اور سیر ہوگا۔ اپنے ہی عرفان سے میرا صادق خادم بہتوں کو راستباز ٹھہرائے گا کیونکہ وہ انکی بدکرداری خود اٹھا لے گا۔ اس لئے میں اسے بزرگوں کے ساتھ حصہ دوں گا اور وہ لوٹ کا مال زور آوروں کے ساتھ بانٹ لے گا کیونکہ اس نے اپنی جان موت کے لئے اُنڈیل دی اور وہ خطاکاروں کے ساتھ شمار کیا گیا تو بھی اس نے بہتوں کے گناہ اُٹھا لئے اور خطاکاروں کی شفاعت کی۔"

عارضہ گناہ کی ابتدا

خدا نے انسان کو اپنی شبیہہ پر خلق کیا اور دیگر مخلوقِ ارضی پر اور زمین کو معمور و محکوم کرنے کا اختیار عطا فرمایا۔ نیز خدا تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔ (پیدائش ۲:۱٦)

اس حقیقت کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے

وَ قُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَ کُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (سورہ بقر آیہ ۳۵) پھر ہم نے آدم سے کہا تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ مگر اس درخت کا (پھل نہ کھانا) رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار کئے جاؤ گے۔"

لیکن آدم و حوا نے ابلیسِ لعین کے بہکاوے سے شجرِ ممنوعہ میں سے کھایا اور غیر فانی خدا کے جلال کی عظمت و تقدس کو پیشِ نظر نہ رکھا بلکہ راندہ ءافلاک کی مشورت کو حکمِ خداوندی پر ترجیح دی۔ ازیں جہت ان کی عقل و دل دونوں گناہ آلودہ ہو گئے اور بہیمت کی پستیوں میں جا پڑے اس سبب سے آدم و حوّا اور خدا کی طبیعت میں تفاوت و ناموافقت پیدا ہو گئی اور یوں خدا اور انسان کا اکٹھا رہنا ناممکن ہو گیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خدا نے آدم و حوا کی نافرمانی کے نتیجہ میں انہیں فنا و بطالت اور گناہ کی حاکمیت کے احاطہء اختیار میں کر دیا۔ چونکہ خدا تعالیٰ قدوس ہے اور اسکی قدوسیت ہر طرح کی ناپاکی کی ضد ہے (جیسے روشنی اور تاریکی آپس میں خد کے طور پر ہیں) اس لئے خدا کی طبیعت اور آدم و حوا کی طبیعت میں تفاوت، بعُد المشرِقین اور ناموافقت پیدا ہو گئی یعنی دونوں (خدا اور آدم) کی طبائع ایک دوسرے کی ضد کے طور پر ہو گئیں۔ چونکہ ضدین کا اجتماع محال ہے اس لئے خدا نے انہیں باغِ عدن سے باہر کر دیا۔ پیدائش ۳:۲۳ قرآن شریف میں اس کا ذکر یوں وارد ہوا ہے۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا...... سورہ بقرآیہ ۳۶

ترجمہ: آخرکار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے ہم نے حکم دیا کہ "اب تم یہاں سے اتر جاؤ"

گناہ عارضہء انضمامی ہے

کتابِ مقدس سے یہ حقیقت مبرہن ہے کہ خدا تعالیٰ پاک و قدوس ہے اور اس کی قدوسیت سے کسی طرح کی ناپاکی کا صدور ناممکن و محال قطعی ہے۔ جیسے سورج سے صرف شعاع نور کا صدور ممکن ہے نہ کہ تاریکی کا۔ بنابریں جہالت، منبع ءعلم نہیں، نہ کوڑھ سرچشمہءحُسن ہے اور نہ ہی ظلم و تیرگی اجالوں کی خالق ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ضد اپنی متبائن ضد کی خالق نہیں ہوسکتی ایسے ہی خدا تعالیٰ جو پاک و قدوس ہے اس سے کسی طرح کی ناپاک طبیعت کی تخلیق کیونکر ممکن ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے انسان کو پاک وراست خلق کیا اور یہی انسان کی فطرتِ اوّلہ ہے جس پر وہ خلق ہوا۔

جاننا چاہیئے کہ گناہ جُز وانسانیت نہیں ہے بلکہ عارضہءانضمامی ہے جو درج ذیل دلائل سے ثابت ہے (Sin is not our first nature)

(ا) جو بات کسی ذی حیات جنس کی ذات کا خاصہ نہیں وہ اس کے لئے نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت ہوگی۔ اب دیکھئے کہ صحتِ جسمانی انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے اس لئے اس سے اس کو کوئی تکلیف یا نقصان نہیں ہوتا لیکن مرض جُزِ وانسانیت نہیں بلکہ ایک غیر شئے ہے اس لئے اس سے دُکھ اور نقصان ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر سانپ کے لئے مضرت رساں نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کا خاصہءذاتی ہے۔ سانپ کسی کو ڈس کر خوش ہوتا ہے۔ ہم کانوں سے کچھ سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی بہرہ ہو جائے تو وہ بہت ناخوش اور رنجیدہ ہوتا ہے کیونکہ بہرہ پن فطری خاصہ نہیں ہے۔ اسی طرح گناہ سے انسان کو دکھ اور رنج محسوس ہوتا ہے اس

لئے وہ فطرتِ انسانی کا خاصہء ذاتی نہیں ہے۔

(۲) چونکہ گناہ کرنے کے بعد انسان کو ایک تو رنج ہوتا ہے اور دوسرے اس فعلِ ناکردنی پر پچھتانا پڑتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ انسانی فطرت کا خاصہ نہیں ہے۔ پطرس نے مسیح کا انکار کیا' اور پچھتا کر زار زار رویا۔ یہوداہ اسکریوتی نے مسیح کے ساتھ غداری کی اور اس کا غم اور پچھتاوا خود کشی پر منتج ہوا۔ پس اگر گناہ ذاتی خاصہ ہوتا تو اس سے خوشی ہی حاصل ہوتی نہ کہ رنج اور پچھتاوا۔ اگر کوئی خوشی ہوتی بھی ہے تو بہت تھوڑے عرصے کی۔ جیسے شراب پینے سے ایک آدھ گھنٹہ کے لئے ضرور ہوتا ہے لیکن بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کسی نہ کسی وقت اپنے گناہ پر ضرور نادم ہوتا اور پچھتاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ چور کو چوری کرنے سے ہمیشہ خوشی ہی ہوتی ہے اور پچھتاوا کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوری سے جو مال و دولت ہاتھ آتا ہے وہ اس کی طبیعت پر رنج و پچھتاوے کو غالب آنے نہیں دیتا تو اس کے جواب میں اس قدر عرض ہے کہ اگر خود چور کے گھر میں چوری ہو جائے تو کیا پھر بھی اسے خوشی حاصل ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ اس کو ضرور رنج اور افسوس ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے اور گناہ فطرتِ انسانی کا خاصہ نہیں بلکہ غیر شئے ہے۔ لہٰذا اس سے آزاد ہونا اصلی فطرت کا تقاضا ہے۔

(۳) گناہ تمام افرادِ عالم میں یکساں نہیں اس لئے طبیعتِ اوّلہ نہیں بلکہ ثانیہ ہے۔ کسی میں ایک گناہ ہے اور دوسرے میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ ایک شخص خونی تو ہے مگر غربا کے ساتھ بہت ہمدردی کرتا ہے۔ ایک آدمی زانی تو ہے مگر خونی نہیں ہے۔ ایک آدمی لالچی تو ہے مگر سچ بولنے میں مشہور ہے۔ ایک آدمی بت پرست تو ہے مگر جھوٹ، فریب، خون ریزی اور ظلم وغیرہ سے نفرت کرتا ہے۔ جس طرح سانس لینا، سننا، سونگھنا، سونا، جاگنا، کھانا پینا وغیرہ ذاتی خصائص تمام افرادِ عالم میں یکساں ہیں اسی طرح گناہ انسان کی ذاتیات کا جز ہوتا تو تمام نوعِ انسان میں یکساں ہوتا یعنی اگر ایک شخص چوری کرتا تو تمام دُنیا چوری کرتی۔ اگر ایک شخص جھوٹ بولتا تو ضرور تھا کہ دنیا کے تمام لوگ جھوٹ بولا کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہے لہٰذا

گناہ جُز وِ انسانیت نہیں ہے۔

(۴) خدائے قدوس سے ناپاک طبیعت کے معلول کا صادر ہونا قطعی ممتنع و محال ہے کیونکہ قدؔوسیّت اور ناپاکی باہم دگر نقیضین ہیں اور ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت نہیں ہوسکتی جیسے آفتاب میں سے تاریکی کبھی صادر نہیں ہوسکتی۔

(۵) گناہ کو جُز وفطرت انسانی ماننے سے احکام و شرائع اور اوامر ونواہی ءالٰہیہ کا بطلان لازم آئے گا۔ خدا خود گناہ کو انسان کی طبیعت میں پیدا کر کے اسکے خلاف احکام صادر نہیں کر سکتا۔

(۶) اگر گناہ عرضِ ذاتی ہے تو خُدا تعالیٰ کسی کو سزا و جزا نہیں دے سکتا اور ابدی عدالت و ابدی زندگی سے انکار لازم آئے گا۔

(۷) خدا کے تمام انتظامات در بارہ ازالہء گناہ اور نجاتِ بنی نوعِ انسان باطل ٹھہریں گے کیونکہ خاصہءذاتی کا انفکاک (الگ کرنا) اپنی ذات سے محال ہے۔

(۸) گناہ و بدی کے حامل ہونا خدا کی عین فرمانبرداری ہوگی اور نیکی کے عامل ہونا خدا سے سرکشی و مخالفت کرنا ہوگا۔ (مراۃُ الحق)

ایک اور طرز سے

کسی نے کہا ہے

زہر کار را باید حیات
نستبش با آدمی آمد مماۃ

ترجمہ: سانپ کا زہر سانپ کے لئے زندگی ہے۔ لیکن جب آدمی کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو اُس کے لئے موت بن جاتا ہے۔ گناہ کا بھی یہی حال ہے اسکے تاریک اور زہریلے اثرات نے اسے جواہر غاسقہ (تاریکی) میں بدل دیا ہے۔ گناہ نے انسان کو نورِ مقدس اور نور الانوار کی ضیا پاشیوں سے الگ کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہوگئے۔

اس کے قلب پر ظلمتِ تلبیسی محیط ہوگئی اور بالآخر انسان کو بہیمت اور اموات کی وادیوں میں دھکیل دیا۔

گناہ کے نتائج

(۱) خدا اور انسان کے درمیان جدائی و دُوری پیدا ہوگئی اس دوری سے مراد بعُد مکانی نہیں بلکہ تفاوتِ طبع یعنی طبعی ناموافقت پیدا ہوگئی۔

(۲) حکمِ خداوندی کے مطابق "جس روز تو نے شجرِ ممنوعہ میں سے کھایا تو مرا" جب اس حکم کی نافرمانی کے اثرات آدم وحوا پر مرتب ہوئے تو موت ان پر مُسلط ہوگئی اور بلاشُبہ ذریّتِ آدم بھی اس ہبوط و زوال میں شریک ہے۔ جیسا کہ کتابِ مقدس میں وارد ہوا ہے۔ "پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ (رومیوں ۵:۱۲) اور قرآن شریف میں یوں آیا ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے (سورہ العنکبوت آیہ ۵۷)۔

اُس کی جان گناہ کی قربانی کے لئے گذرانی جائے گی (یسعیاہ ۵۳:۱۰)

عہدِ عتیق میں گناہ کی قربانی کے بارے میں احبار کی کتاب کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں بالتفصیل بیان کیا گیا ہے کہ گناہ کی قربانی کے لئے (گناہ چاہے دیدہ دانستہ ہو یا نادانستہ طور پر سرزد ہو) بکرا ہو یا بچھڑا اس کا بے عیب ہونا ضروری ہے اور قربانی دینے والا اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے پھر اسے خداوند کے آگے ذبح کیا جائے اور قُربان گاہ پر جلایا جائے۔ دراصل یہ قربانیاں آنے والی قربانی کا سایہ اور عکس تھیں۔ چنانچہ عبرانیوں ۱۰ باب میں اس حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

"کیونکہ شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کا عکس ہے اور ان چیزوں کی اصلی صورت نہیں ان ایک ہی طرح کی قربانیوں سے جو ہر سال بلا ناغہ گذرانی جاتی ہیں پاس آنے والوں کو ہرگز کامل نہیں کرسکتی ورنہ ان کا گذرانا موقوف نہ ہو جاتا۔ کیونکہ جب عبادت کرنے

والے ایک بار پاک ہو جاتے تو پھر ان کا دل ان کو انہیں گنہگار نہ ٹھہراتا بلکہ وہ قربانیاں سال بہ سال گناہوں کو یاد دلاتی ہیں کیونکہ ممکن نہیں ہے کہ بیلوں اور بکروں کا خون گناہوں کو دور کرے۔ اسی لئے وہ دنیا میں آتے وقت کہتا ہے کہ تو نے قربانی اور نذر کو پسند نہ کیا بلکہ میرے لئے ایک بدن تیار کیا۔ پوری سوختنی قُربانیوں اور گناہ کی قُربانیوں سے تُو خوش نہ ہوا۔ اُس وقت میں نے کہا دیکھ !میں آیا ہوں تا کہ اے! خدا تیری مرضی پوری کروں۔ اوپر تو وہ فرماتا ہے کہ نہ تو نے قربانیوں اور نذروں اور پوری سوختنی قربانیوں اور گناہ کی قربانیوں کو پسند کیا اور نہ ان سے خوش ہوا حالانکہ وہ قربانیاں شریعت کے موافق گذرانی جاتی ہیں اور پھر یہ کہتا ہے کہ دیکھ میں آیا ہوں کہ تیری مرضی پوری کروں۔ غرض وہ پہلے کو موقوف کرتا ہے تا کہ دوسرے کو قایم کرے۔ اسی کی مرضی کے سبب سے ہم یسوع مسیح کے جسم کے ایک ہی بار قربان ہونے کے وسیلہ سے پاک کئے گئے ہیں اور ہر ایک کاہن تو کھڑا ہو کر ہر روز عبادت کرتا ہے اور ایک ہی طرح کی قربانیاں بار بار گذرانتا ہے جو ہرگز گناہوں کو دور نہیں کر سکتیں لیکن یہ شخص ہمیشہ کے لئے گناہوں کے واسطے ایک ہی قربانی گذران کر خدا کی دہنی طرف جا بیٹھا۔"

مُقدس یُوحنّا (حضرت یحیٰی) نبی جب یسوع مسیح کو اپنی طرف آتے دیکھتا ہے تو فرماتا ہے کہ دیکھو خدا کا برّہ جو جہان کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے۔

ا۔ یوحنا ۳:۵ا میں وارد ہوا ہے کہ وہ اس لئے ظاہر ہوا تھا کہ گناہوں کو اُٹھا لے جائے اور اس کی ذات میں گناہ نہیں۔ پطرس رسول رُوح القدس کی تحریک سے اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے "وہ آپ ہمارے گناہوں کو اپنے بدن پر لئے ہوئے صلیب پر چڑھ گیا تا کہ ہم گناہوں کے اعتبار سے مر کر راستبازی کے اعتبار سے جئیں اور اسی کے مار کھانے سے ہم نے شفا پائی۔

اسی سبب سے ذبح کیا ہوا برّہ ہی قدرت اور دولت اور حکمت اور طاقت اور عزّت اور تمجید اور حمد کے لائق ہے کیونکہ اس نے ذبح ہو کر اپنے خون سے ہر ایک قبیلہ اور اہلِ زبان اور

امت اور قوم میں سے خدا کے واسطے لوگوں کو خرید لیا اور ان کو ہمارے خدا کے لئے ایک بادشاہی اور کاہن بنادیا اور وہ زمین پر بادشاہی کرتے ہیں۔(مکاشفہ ۵:۹ تا۱۲)

خدا کے برّے کی قربانی کی مثال

عہدِ عتیق میں خدا کے برّے کی قربانی کی مثال ابرہام کے بیٹے کی قربانی ہے۔ جس کی تفصیل پیدائش ۲۲ باب میں یوں بیان کی گئی ہے۔''خدا نے ابرہام سے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا تب ابرہام نے صبح سویرے...... اپنے بیٹے اضحاق کو لیا...... اور اُٹھ کر اس جگہ کو جو خدا نے اسے بتائی تھی روانہ ہوا۔...... اور ابرہام نے سوختنی قربانی کی لکڑیاں لے کر اپنے بیٹے اضحاق پر رکھیں اور آگ اور چھری اپنے ہاتھ میں لی اور دونوں اکٹھے روانہ ہوئے۔ تب اضحاق نے اپنے باپ ابراہام سے کہا اے باپ! اس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے میں حاضر ہوں۔ اس نے کہا دیکھ آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لئے برّہ کہاں ہے؟ ابرہام نے کہا اے میرے بیٹے خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لئے برّہ مہیا کرے گا۔ سو وہ دونوں آگے چلتے گئے اور اس جگہ پہنچے جو خدا نے بتائی تھی وہاں ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹھے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتہ نے اسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام اے ابرہام! اس نے کہا میں حاضر ہوں پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اس سے کچھ کر کیونکہ اب میں جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ کیا اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا...... تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے (عوض) بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا اور ابرہام نے اس جگہ کا نام یہوواہ یرّی رکھا...... کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا۔''

اس قربانی سے ابرہام کی محبت کا کمال ظاہر ہوتا ہے اس صفحۂ ہستی پر ابرہام کی زندگی

جتوں کا چراغ نظر آتی ہے۔ کیونکہ ابرہام نے پہلے اپنے وطن، اپنے ناتے داروں اور باپ کے گھر کی قربانی دی پھر اپنے بیٹے اسماعیل کی جدائی کی قربانی دی اور بالآخر اپنے بیٹے اضحاق کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ ان قربانیوں سے مُبرہن ہے کہ جب ابرہام کی محبت اپنی انتہا تک پہنچی تو خدا کی محبت نے بھی اس کے بیٹے کے بدلے برّہ مہیا کیا جو اضحاق کے بدلے ذبح کیا گیا جس سے ابرہام کے بیٹھے کو زندگی ملی۔

اسی طرح ابرہام کی محبت کے بالمقابل جب خدا کی بے پایاں محبت نقطہء عروج تک پہنچتی ہے تو اس نے بیٹے کو گناہ آلودہ جسم کی صورت اور گناہ کی قربانی کے لئے بھیج کر جسم میں گناہ کی سزا کا حکم دیا (رومیوں ۸: ۳) اور اپنی محبت کی خوبی کو یوں ظاہر فرمایا "کہ جب ہم بے دین ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر مؤا۔ (رومیوں ۵: ۸) دراصل مسیح کی قربانی خدا کی محبت کی قربانی ہے جو انتہائی درجہ کے گناہ گار انسانوں حتیٰ کہ دشمنوں کو گلے لگا لیتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اے باپ! ان کو معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں۔ (لوقا ۲۳: ۳۴) ابرہام کی قربانی سے صرف اس کے بیٹے کو زندگی ملی لیکن خدا کے برّے کی قربانی (جو نہ صرف ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے بلکہ تمام دُنیا کے گناہوں کا بھی ا۔ یوحنا ۲: ۲) سے ایسی زندگی ملی جس پر موت کی خزاں کبھی اثر انداز نہیں ہوسکتی اور نہ ہی زمانے کی گردشیں اسے متاثر کرسکتی ہیں۔

ایک غلطی کا اِزالہ

اَسرارُالقِدم (فُصُوصِ الحِکَم) میں حضرت مولانا پیر غلام مُحمد صاحب زیرِ عنوان فَصُّ حِکْمَۃٍ حَقِّیَۃٍ فی کَلِمَۃٍ اسحاقیہ لکھتے ہیں حکمت حقیہ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے کی حکمت یہ ہے کہ آپ نے اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رویاء کو حق جانا تھا اور کہا تھا یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ) سارے عالم میں یہ غلط عقیدہ پھیل گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح ہیں حالانکہ حق بات یہ ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہیں۔ سورہ صافات رکوع ۳ میں یہ سارا

قصہ مذکور ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نیک لڑکے کے لئے دُعا مانگنا پھر حق تعالیٰ کا ایک حلیم الطبع لڑکا عطا کرنا پھر اس لڑکے کا باپ کے ساتھ دوڑنا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس لڑکے کو ذبح کرنا پھر باپ اور بیٹے کا امتحان میں کامیاب ہونا مکمل مذکور ہے۔ اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ربّ تعالیٰ فرماتا ہے وَبَشَّرْنٰہُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ اور ہم نے ذبح کے واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی کہ آپ کا بیٹا اسحٰق نبی ہوگا۔ اس سارے واقعہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام تک نہیں امام عبدالرؤف المنادی کتاب کُنوز فی حدیث الخلائق میں حدیث شریف نقل کرتے ہیں الذبیح ہو اسحٰق ذبیح اِسحٰق ہے قاضی عیاض الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ جز اوّل صفحہ ۵۸ پر فرماتے ہیں۔

وَقِیْلَ اِنَّ اِلْقَاءِ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامِ فِی النَّارِ وَمِحْنَتَہٗ کَانَتْ وَھُوَ ابْنُ سِتَّ عَشَرَۃَ سَنَۃً وَ اَنَّ اُبْتِلَاءِ اِسْحٰقَ بِالذَّبْحِ کَانَ وَھُوَ ابْنُ سَبْعِ سِنِیْنَ اور بعض نے کہا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے اور آپ کی آزمائش کی گئی اسوقت آپ ۱۶ سال کی عمر کے تھے۔ اور جب حضرت اسحاق علیہ السلام ذبح کی آزمائش میں ڈالے گئے تو اس وقت آپ کی عمر ۷ سال کی تھی۔ مشکوٰۃ شریف باب فِی النُّذُورِ میں حدیث شریف مندرج ہے حضرت محمد بن منتشرؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کو دشمن کے ہاتھ سے نجات دلا دے تو وہ اپنے آپ کو قربان یعنی ذبح کر ڈالے گا۔ جب خداوند تعالیٰ نے اس کو دشمن کے ہاتھ سے بچا دیا تو اس نے اپنی نظر کی بابت ابنِ عباسؓ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ مسروقؔ سے دریافت کر و اس نے مسروقؔ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا اپنے آپ کو ذبح نہ کر اس لئے کہ اگر تو مسلمان ہے تو ایک مسلمان کی جان کے قتل کا مرتکب ہوگا اور اگر تو کافر ہے اور اگر تو کافر ہے تو دوزخ کی جانب اپنے آپ کو جلد لے جائے گا۔ پس تو ایک دُنبہ خرید کر اور مسکینوں کے لئے اس کو ذبح کر دے۔ حضرت اسحاق تجھ سے بہتر تھے جنکا فدیہ ایک دنبہ سے دیا گیا تھا۔ اُس شخص نے اس جواب سے ابنِ عباسؓ کو آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی تجھ کو یہی جواب دینے کا ارادہ رکھتا تھا (رزین) اسی میں صریح دلالت ہے کہ صحابہ اکرام بالخصوص حضرت ابنِ عباسؔ رضی اللہ عنہما کا یہی عقیدہ تھا کہ

ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں عالی سرکار حضرت غوثِ اعظم پاک پیرانِ دستگیر میراں محی الدین شیخ سید عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانیؒ اپنی کتاب فتوح الغیب اَلْمَقَالَۃُ اَلْغَامِسَۃُ وَالسَّبْعُونَ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ وَالتَّصَوُّف مَبْنیٌ علیٰ ثَمان خِصَال اَلسَّغَا لِلِابْرَاھِیم وَ الرِّضَاءُ لِلِاسْحَاق حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی قُدِّس سَرہٗ شرح فتوح الغیب میں فرماتے ہیں وَ التَّصَوُّف...... خِصال وکارِ تصوف نہادہ شدہ است بر ہشت خصلت اَلسَّغَالِلِابْرَاھِیم سخاوتے کہ ثابت بُود ابراہیم رو علیہ السلام کہ ہمیشہ ضیافت کردے و بذل اموال در محبتِ حق نمودے وَالرِّضَاءُ لِلِاسحَاق ورضا ع بقنائی خدا کہ اسحاق علیہ السلام داشت خصوصاً برقولے کہ گویند کہ ذبیح اللہ اسحاق بُود وایں قول درکلام ایشاں درجای دیگر نیز منقول است۔ سُبحان اللہ! حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی قُدِس سرہٗ کیسے احسن پیرایہ سے عالی سرکار جناب حضرت غوثِ اعظمؒ کا عقیدہ مبارک پیش کرتے ہیں کہ ذبیح اللہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ کتاب فُصُوص الحِکَم اگرچہ بظاہر حضرت شیخ الاکبرؒ کی طرف منسوب ہے۔ لیکن دیباچہ کی رُو سے یہ سب کلام حقیقتاً حضُور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس لئے اب کسی مسلمان کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس حقیقت کا انکار کرے۔

(۱) کیا ایک نبی کے بدلے ایک ذبیح کا ذبح کرنا قربِ حق کا باعث ہے؟ اور کہاں ہے مینڈھے کی آواز برابر آواز انسان کے۔ مراد یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے گلے پر پورے زور سے چھری چلادی تو وہ آزمائش میں پورے اترے۔ لیکن حق تعالیٰ کی محبت اور رحمت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ لڑکے کے فراق میں تڑپیں اس لئے حق تعالیٰ نے جنت سے دنبہ منگوایا اور جبرائیل علیہ السلام نے بیٹے کو سرکا دیا اور دنبہ رکھ دیا۔ آنکھیں کھولیں تو دُنبہ ذبح پڑا تھا۔

لِقَوْلِہٖ تَعَالیٰ وَنَادَیْنٰہُ اَنْ یّآ بْرٰاھِیمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِ الْمُحْسِنِین ٥ اِنَّ ھٰذا لَھُوَ الْبَلٰوءُا الْمُبِیْنُ ٥ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ اب اگرچہ ذبح تو ہوا

دنبہ لیکن اجر بیٹے کے ذبح کرنے کے مساوی ہے۔

(۲) خدا تعالیٰ نے اس منیڈھے کی قربانی کو از روئے عنایت قرآن مجید میں بذبحٍ عظیم سے یاد فرمایا ہے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ذبح کی عظمت کس قسم کے تراز ورحمت سے ہے۔ آیا یہ عظمت کبش کی وجہ سے ہے یا نبی کی وجہ سے یعنی کبش کو عظیم فرمانے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ از روئے عنایت حق تعالیٰ نے کبش کو نبی کا درجہ عطا کر دیا۔ کیونکہ ذبح نبی ذبح کبش ٹھہرا گویا حق تعالیٰ نے اپنی رحمت واسع سے کبش کو نبی کے ہم پلہ اور ہم درجہ ٹھہرایا۔ اور اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا بقولہ تعالیٰ

قُل انَّ الفَضلَ بِیَدِ اللہ یُؤ یتہٖ مَن یَّشآ ءُ وَاللہُ وَاسِعٌ عَلیم ' یَّختَصُّ بِرَحمَتہٖ مَن یَّشآ ءُ وَاللہُ ذُوالفَضلِ العَظِیم

دُوسری وجہ عظمت یہ ہے کہ وہ کبش ایک نبی کا بدلہ ٹھہرا۔

(۳) اور اس میں شک نہیں کہ قیمت کی رُو سے اونٹ مینڈھے سے بہت بڑا ہے۔ لیکن قربتِ حق کے واسطے اونٹ ذبح مینڈھے سے کم مرتبہ والا ٹھہرا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی سے پیشتر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کئی اونٹ ذبح کئے لیکن رب تعالیٰ راضی نہ ہوئے رب تعالیٰ بالآخر اسحاق علیہ السلام کی قربانی پر راضی ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنے عشق میں صادق پا کر اپنی قدرتِ کاملہ سے مینڈھا ذبح کرا دیا۔ رب تعالیٰ کی عنایت دیکھئے۔ جب اس مینڈھے پر نگاہ پڑی اونٹ تو در کنار ذبح کبش ذبح نبی ٹھہرا۔

پس کاشکہ میں اس امر کو جانتا کہ مینڈھے کا چھوٹا سا جسم خلیفہ ءِ رحمان یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام کا کیسے بذاتہٖ نائب بن گیا...... انبیاء اور اولیا کی رب تعالیٰ ہمیشہ آزمائش کرتا ہے کہ آیا وہ عشقِ الٰہی میں صادق ہیں یا نہیں اور عاشق پر فرض ہے کہ معشوق پر اپنی ہر چیز قربان کرے اور معشوق کے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ پس حضرت ابراہیم نے اپنے عہد کی وفا کی۔ اور رب تعالیٰ نے بھی اپنی کمال محبت و شفقت کا اظہار کیا بیٹا بھی بچا دیا، قربانی کی یاد بھی ابدالآباد تک قائم کر

دی۔ اور رب تعالیٰ کی دوستی اور انعام و کرام تا ابد نصیب ہو گئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل رضا الٰہی کے لئے کی اس لئے رب تعالیٰ نے نبوت کی بشارت ساتھ ہی دے دی۔ لِقولہ تعالیٰ وَبَشَّرْنٰہُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ ہمارے مفسّرین صرف اس لئے کہ حضورؐ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں زور دیتے ہیں کہ ذبیح اللہ اسماعیل ہیں اسحاق نہیں اور یہود پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ انہوں نے تورات میں اسماعیل کا نام کاٹ کر اسحاق لکھ دیا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا امتحان اس سے کم نہیں بچپن میں بمعہ والدہ ماجدہ گھر سے دیس نکالا اُس اُجاڑ ویرانے میں نصیب ہوا جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز مُیسّر نہیں پھر باپ کے ہوتے ہوئے باپ سے جدائی رضا الٰہی کی خاطر برداشت کرنی اور پھر تا زیست ایسی قربانی ہے جس پر اسحاق علیہ السلام کی ہزار قربانی قربان کی جا سکتی ہے۔ وہ لحظہ بھر کی قربانی تھی اور یہ عمر بھر کی قربانی وہاں تقدیرِ الٰہی نے صرف امتحان لیا اور یہاں تقدیرِ الٰہی وارد ہوئی۔ اہلِ کشف کے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مقام حضرت اسحاق علیہ السلام سے بہت ہی بلند ہے پھر خانہ کعبہ کی تعمیر بھی رب تعالیٰ نے ان ہی کے ہاتھِ مبارک سے کرائی اور پھر سب سے بڑی فضیلت یہ کہ جناب محمد پاکؐ کا نوران ہی کے ماتھے مبارک پر چمکا۔ اگر حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح مان لیا جائے تو ان کی فضیلت میں کیا کمی واقع ہوتی ہے اور پھر جب یہ کتاب فُصُوص الحِکَم حضورؐ کی طرف منسوب ہے اور آپ فرما رہے ہیں کہ اسحاق علیہ السلام ہی موردِ رُویائے ابراہیم علیہ السلام ہیں تو عُلما کرام کو چاہیئے کہ ادب اختیار کریں اور اپنے عقلی ڈھکوسلے ترک کر دیں

عقل را قُربان کُن بہ پیشِ مُصطفےٰؐ

(فُصُوص الحِکَم صفحہ ۱۲۱ تا آخر)

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ۔

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں بولے کیا ایسے کو نائب کرے جو اس میں فساد پھیلائے اور جو خونریزیاں کرے۔

خدا کا برّہ جس کا علم تو بنائے عالم سے پیشتر تھا مگر ظہور آخیر زمانہ میں تمہاری خاطر ہوا۔ (۱۔پطرس ۱:۲۰) اس فضل کے موافق جو مسیح یسوع میں ہم پر ازل سے ہوا مگر اب ہمارے منجی مسیح یسوع کے ظہور سے ظاہر ہوا جس نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو روشن کر دیا۔(۲۔تیمتھیس ۱:۹،۱۰)

مذکورہ آیاتِ مقدسہ کے اسرار و حقائق الٰہیہ کو سمجھنے کے لئے جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے (انّکَ انتَ علّامہ الغُیُوب بے شک تو ہی ہے سب غیبوں کا خوب جاننے والا۔ سورہ مائدہ آیہ ۱۱۶) اور اس کا علم غیب کسی غیر کا محتاج نہیں۔ وہ تمام انواع و اجسام کی تخلیق سے قبل اُن کی تفصیل کلی سے ازل ہی سے واقف تھا ازیں جہت وہ آدم کی شکل و شباہت اور اس کے ظاہری نقوش ہبوط و زوال اور اس کی نسل کے اعمال، خیالات و تصورات اس کے احاطہء علم میں ازل ہی سے موجود تھے۔ اس کا علم ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے جو ماضی حال اور مستقبل کی گرفت زمانی سے باہر ہے۔ (میں خُدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا ہی سے انجام کی خبر دیتا ہوں اور ایامِ قدیم سے وہ باتیں جواب تک وقوع میں نہیں آئیں بتاتا ہوں۔ (یسعیاہ ۴۶:۹،۱۰) خدا تعالیٰ ازل، ہی سے شمع ء الہام کے بالمقابل انسانوں کی من گھڑت مُلحدانہ فاسد خیالات و نظریات، کفر و شرک اور مکروہات سے واقف تھا وہ تخلیقِ کائنات سے پیشتر ہی جانتا تھا کہ نسلِ آدم اس کے غیر فانی الٰہی جلال کو فانی انسان، بہائم اور حشرات الارض کی صورت میں بدل ڈالے گی۔ (رومیوں ۱:۲۲) اور اس کے پاک نام پر کفر بکے گی اور شریعت کے عدول سے اس کی توہین و بے عزتی کرے گی (رومیوں ۲:۲۳) تو بھی خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی شبیہہ پر خلق کیا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جیسے خدا تعالیٰ کو گناہ کا علم ازل ہی سے تھا۔ ایسے ہی ازالہ ء گناہ کے لئے خدا کا برّہ (مسیح یسوع) زمانہء ازل میں بطورِ کفارہ اس کے ازلی ارادہ میں ذبح ہو چکا تھا بدیں وجہ مسیح یسوع کو ازلی ذبیح اللہ کہا جاتا ہے جس کا ظہور زمانہ کے آخر میں ہماری خاطر کلوری کے مقام پر ہوا۔

(۲) چونکہ خدا کی شریعت کے عدول سے خدا کی بے عزتی ہوتی ہے (رومیوں ۲:۲۳) اور خدا یہ توہین و بے عزتی (مخلوقات کی تخلیق سے پیشتر) ازل ہی سے اپنی ذات کے اندر ہی اندر

برداشت کر رہا تھا۔ وہی توہین و بے عزتی مسیح یسوع نے بطور نمائندہ ءخدا اس زمانہ کے آخر میں ہماری خاطر برداشت کی۔ اسی سبب سے مسیح میں اس کے فضل کا ایسا ظہور ہوا۔ جو ہماری نجات کا باعث ہے۔ جیسا کہ کتابِ مقدس میں وارد ہوا ہے۔ "کیونکہ خدا کا وہ فضل ظاہر ہوا ہے جو سب آدمیوں کی نجات کا باعث ہے اور ہمیں تربیت دیتا ہے تاکہ بیدینی اور دنیوی خواہشوں کا انکار کرے اس موجودہ جہان میں پرہیزگاری اور راستبازی اور دینداری کے ساتھ زندگی گزاریں اور اس مبارک امید یعنی اپنے بزرگ خدا اور منجی یسوع مسیح کے جلال کے ظاہر ہونے کے منتظر رہیں جس نے اپنے آپ کو ہمارے واسطے دے دیا تاکہ فدیہ (فدیہ سے مراد مخلوقات کے گناہوں کا کفارہ اور خدا کی توہین و بے عزتی کا فدیہ) ہو کر ہمیں ہر طرح کی بے دینی سے چھڑا لے اور پاک کر کے اپنی خاص ملکیت کے لئے ایک ایسی امت بنائے جو نیک کاموں میں سرگرم ہو۔ (طِطُس ۲: ۱۱ تا ۱۴)

آدمِ اوّل و آدمِ ثانی

اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَ اللہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (سورہ آل عمران آیہ ۵۹)

ترجمہ: اللہ کے نزدیک عیسٰی کی مثال آدم کی سی ہے۔

آدم بغیر والدین کے پیدا ہوا اسی طرح مسیح بھی والدین کے اشتراکِ جنسی کے بغیر پیدا ہوا۔ آدم کی تخلیق میں نفسِ امارہ کو دخل نہ تھا۔ اسی طرح مسیح کی بشریت بھی نفسِ امارہ سے مُبّرا تھی خدا نے آدم کو اپنی شبیہہ پر خلق کیا۔ یعنی صفاتِ الٰہیہ کا عکس آدم میں نظر آتا ہے جیسے پاکیزگی، حاکمیت وغیرہ ان صفات کے نسبت سے آدم خدا کا بیٹا ٹھہرا۔ (جیسے بچے کے نقوش وجود کی نسبت والدین سے ہوتی ہے) اسی طرح مسیح بھی اندیکھے خدا کی صورت ہے (کلسیوں ۱: ۱۵) اس سبب سے وہ بھی خدا کا بیٹا ٹھہرا۔ (لوقا ۱: ۳۵) ان تشابہُ صفات کی بنا پر مسیح آدمِ ثانی ہے۔

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ حضرت آدم ابوالبشر ہمارے اجسام کا منبع ہے۔ پیشتر اس کے کہ

اس کی ذرّیت اس کی پشت سے بہہ نکلی ۔ نوعِ انسانی کی ہر ہر جزی جسدِ آدم میں موجود تھی ۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ ہماری ولادت سے پیشتر ہمارے اجسام ہمارے والدین میں موجود تھے ۔ لیکن جب والدین کی قوتوں کا اجتماع بطریقِ اشتراک جنسی استقرارِ حمل کی صورت ہوا تو ہم میں سے ہر ایک کا جسم مصلحتِ ایزدی کے مطابق مرتب ہوا اسی طرح ہمارے والدین کے اجسام انکے والدین میں پھر ان کے والدین علٰی ہٰذا القیاس تمام نوعِ انسانی کے اجسام آدم میں موجود تھے ۔ اور جب خدا نے آدم سے فرمایا قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اُتر جاؤ تو ہم سب آدم میں ہو کر الٰہی حضوری سے نکالے گئے ۔

مزید برآں پولوس رسول آدمِ اوّل کے گناہ کے انجام اور مسیح (آدمِ ثانی) کے فضل کی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ گناہ کا جو حال ہے وہ فضل کی نعمت کا نہیں کیونکہ جب ایک شخص (آدمِ اول) کے گناہ سے بہت سے آدمی مر گئے تو خدا کا فضل اور اس کی جو بخشش ایک ہی آدمی (آدمِ ثانی) یعنی یسوع مسیح کے فضل سے پیدا ہوئی بہت سے افراد پر ضرور ہی افراط سے نازل ہوئی ۔ کیونکہ جب ایک شخص (آدمِ اوّل) کے گناہ کے سبب سے موت نے اس ایک کے ذریعے سے بادشاہی کی جو لوگ فضل اور راستبازی کی بخشش افراط سے حاصل کرتے ہیں وہ ایک شخص (آدمِ ثانی) یعنی یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ کی زندگی میں ضرور ہی بادشاہی کریں گے ۔ (رومیوں ۵: ۱۵، ۱۷) ۔

پس جس طرح نسلِ انسانی آدم اوّل میں ہو کر الٰہی حضوری اور جنت ارضی سے نکالی گئی اسی طرح مخلوقات آدم ثانی یعنی یسوع مسیح میں ہو کر الٰہی حضوری غیر فانی زندگی اور فردوس بریں میں داخل ہوتی ہے ۔

دینداری کا بھید: مسیح کا جسم میں ظہور

اس میں کلام نہیں کہ دینداری کا بھید بڑا ہے یعنی وہ جو جسم میں ظاہر ہوا اور روح میں راستباز ٹھہرا اور فرشتوں کو دکھائی دیا اور غیر قوموں میں اس کی منادی ہوئی اور دُنیا میں اس پر ایمان

لائے اور جلال میں اُوپر اُٹھایا گیا۔(۱۔ تیمتھیس ۳:۱۶)۔اسی نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو روشن کر دیا۔(۲۔ تیمتھیس ۱:۱۰) پس جس صورت میں کہ لڑکے خون اور گوشت میں شریک ہیں تو وہ خود بھی اُنکی طرح اُن میں شریک ہؤا تا کہ موت کے وسیلے سے اس کو جسے موت پر قدرت حاصل تھی یعنی ابلیس کو تباہ کر دے۔(عبرانیوں ۲:۱۴)

مذکورہ آیاتِ مقدسہ کا شانِ نزُول

زمانہء قدیم میں جب ایک بادشاہ دوسرے مخالف بادشاہ پر حملہ آور ہوتا تھا تو جب تک وہ مخالف بادشاہ کی مملکت کے صدر مقام پر قابض نہ ہو جاتا تھا فاتح تسلیم نہ کیا جاتا۔لیکن جب مخالف بادشاہ کے صدر مقام پر قابض ہو جاتا تھا تو مفتوح بادشاہ کی رعایا بھی فاتح بادشاہ کے مطیع ہو جاتی تھی۔ اسی طرح مسیح بھی (جس میں زندگی تھی اور زندگی آدمیوں کا نور تھی۔یوحنا ۱:۴) مملکتِ ابلیس کے صدر مقام موت پر حملہ آور ہوا تو اس نے ابلیس اور موت کو شکست دی اور مُردوں میں سے غیر فانی جلال کی حالت میں جی اُٹھنے سے ابلیس اور موت کی شکست اور زندگی اور بقا کی فتح کی مہر ثبت کر دی۔اسی لئے وارد ہؤا ہے کہ اس نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو روشن کر دیا۔(۲۔ تیمتھیس ۱:۱۰)

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جب بیج زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کی قوتیں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں اور اس کے وجودِ ظاہری کو کھا جاتی ہیں مگر جب زمین کی قوتیں بیج کی حقیقی زندگی کے قریب جاتی ہیں تو وہیں فتح کا لقمہ بن جاتی ہیں اور بیج ایک نیا جسم و زندگی لے کر سینہء زمیں پر اپنی جڑیں پیوست کر دیتا ہے۔اسی طرح موت بھی مسیح پر حملہ آور ہوئی تو اس کے ظاہری گوشت پوست کو نگل گئی لیکن جب موت کی قوتیں حقیقی زندگی کے قریب پہنچیں تو وہیں فتح موت کا لقمہ بن گئی اور مسیح مُردوں میں سے غیر فانی حالت میں جی اُٹھا تب یہ قول پورا ہوا جو لکھا ہے کہ موت فتح کا لقمہ ہوگئی۔اے موت تیری فتح کہاں رہی؟ اے موت تیرا ڈنک کہاں رہا؟ (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۵۴،۵۵) اسی لئے وہ فرماتا ہے میں

تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو میرا کلام سنتا اور میرے بھیجنے والے کا یقین کرتا ہے ہمیشہ کی زندگی اس کی ہے اور اس پر سزا کا حکم نہیں ہوتا بلکہ وہ موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔(یوحنا ۵:۲۴)

موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہونے کی مثال

خدا نے جب سمندر کو دو حصوں میں کر دیا تو بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا لیکن جب فرعون اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا تو سمندر گی راہ سے گزرنے لگے تو خدا نے سمندر کو پھر اس کی اصلی حالت پر کر دیا یوں خدا نے فرعون اور اس کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہو سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوٹا۔(خروج ۱۴:۲۲ تا ۲۸) اسی طرح موت ایمانداروں اور بے ایمانوں دونوں پر وارد ہوتی ہے۔ دونوں موت کی راہ سے گزرتے ہیں ایمانداروں کے لئے موت کی راہ آسمانی کنعان یعنی فردوس کا راستہ بن جاتی ہے مگر بے ایمانوں کے لئے مقامِ فنا۔ ہم جانتے ہیں کہ مسیح پر اب موت کا کوئی اختیار نہیں اسی طرح اہلِ ایمان پر بھی موت کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ

مسیحا زندہ جاوید ہے قائم ہے دائم ہے
وہ میرا ہے میں اس کا ہوں نہ وہ فانی نہ میں فانی

(معزز قارئین!
جناب ابراہام نے کس کو قربانی کے لئے پیش کیا؟ متنازعہ ہے۔ یہودیوں کے نزدیک (بمطابق توریت) یہ اضحاق تھے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کون تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ متبادل برّہ مہیا کیا گیا۔ یہ برّہ کس کا تھا؟
اب یہاں دو شخصیتیں موجود ہیں۔ خُدا اور ابرہام۔ ظاہر ہے، برّہ جناب ابرہام کا نہیں تھا۔ یہ خُدا کا برّہ تھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں۔ یہ اُس کی دنیا سے محبت کا اظہار ہے۔ اسی لئے کہا گیا دیکھو خُدا کا برّہ جو جہاں کے گناہ اُٹھا لے جاتا ہے۔ یسوع ہی وہ ازلی برّہ ہیں جو ازل سے ذبح ہوا تاکہ ہم شفا پائیں۔ آئیے اُس کے خون سے خود کو مسح کریں اس سے آپ کو اور آپ کے خاندان کو ابدی برکات حاصل ہوں گی۔)

ختم شد

فلسفہء حُسن

اہلِ یونان چونکہ فطرت کو الوہیت یا حسنِ مطلق کا مظہر تصور کرتے تھے اس لِئے حسنِ فطرت ہی ان کے نزدیک ذاتِ الٰہی کا پرتو ہے لہذا حسن کی تسکین آفرینی مسرت انگیزی اور کیف پروری ہی اس کی پہچان مقرر ہوئی۔ حسن فطرت کو وہ معرفت اور تذکرہ کا سرچشمہ بھی خیال کرتے تھے۔

(قدیم یونانی عقیدے کی رو سے ہر انسانی روح حقیقت اور ممکناتِ زندگی سے آشنا ہوتی ہے کیونکہ یہ عالمِ ارواح سے جو عالمِ حقیقت ہے تعلق رکھتی ہے، لیکن جب کالبِ انسان میں قید ہو جاتی ہے تو سب کچھ بھول جاتی ہے۔ اس بھولی ہوئی حقیقت و واقعیت اور ممکنات زندگی کو خارجی اور داخلی غور و فکر سے دوبارہ یاد میں لانے کو تذکرہ کہتے ہیں انگریزی میں تذکرے کے لئے reminscence کا لفظ استعمال ہوتا ہے)

ان کا عقیدہ تھا کہ حسن کی لاتعداد انواع اور درجے ہیں مگر ان سب کی اصل صرف حسنِ مطلق ہے جو یگانہ و یکتا ہے۔ حسن فطرت یا مجازی حسن تو قابلِ تغیر اور بے ثبات ہے لیکن الوہیتی حسن ابدی یا قدیم ہے اس اعتبار سے ہر حسین شے میں بھی ابدیت کی شان پائی جاتی ہے، کیونکہ الوہیتی حسن میں فی الجملہ شریک ہوتی ہے، یا یہ کہ الوہیتی حسن اُس شے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ فطرت حسین ہے اس لئے کہ وہ اس ازلی و یگانہ حسن میں شریک ہے۔ ہر حسین شے کا نظارہ ہمیں ازلی حسن کی یاد دلاتا ہے اور یہی سرچشمہ ہے اس پراسرار لذت و مسرت کا جو کسی حسین شے کو دیکھ کر ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ یہ ازلی حسن ان لوگوں پر حیرت انگیز جلوہ بن کر ظاہر ہوتا ہے جو اسے محبوب رکھتے ہیں اور جن میں تابِ نظارہ ہوتی ہے، اور جنہیں اس کا عرفان حاصل ہوتا ہے اور پھر دم تک اس کی حمد و عبادت کرتے رہتے ہیں۔

یونانیوں کے نزدیک حسنِ حقیقی کا عرفان ان کا مقصودِ زندگی تھا اور عقل کو چونکہ اس

عرفان یا معرفت کا سرچشمہ خیال کرتے تھے اس لئے خیر کو بھی وہ عقل ہی پر منحصر سمجھتے تھے لیکن عقل کے ساتھ ساتھ وہ اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے تھے جو حسن مطلق کے نظارے اور وصال کی طلب وجستجو کا حقیقی محرک ہے۔اس جذبے کو افلاطون ایروس (eros) یا عشق کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی قلب کی نفسیاتی تحلیل (Psycho analysis) کرنے سے اس واقعیت کا سراغ ملتا ہے کہ انسانی دل جو عشق کا سرچشمہ ہے، زیادہ تر انفعالی قوت رکھتا ہے اس کے برعکس دماغ فاعلی قوت کا حامل ہے اور اس قوت کا سب سے بڑا مظہر عقل ہے۔عقل کا وظیفہ صرف تحلیل واستقصاء استنتاج واستقراء استخراج واستنبط اور تصدیق ومحاکمہ ہی نہیں بلکہ احساسات، جذبات اور ارادوں کی تحریک دینا بھی ہے لہذا عقل کی بالیدگی وسلامتی ہی پر جذباتِ عشق کی بیداری وصحت کا انحصار ہو۔ چنانچہ یہ کہنا کہ عقل ہی جذبۂ عشق کی اصل محرک ہے بے جا نہ ہوگا ۔بہرکیف، قدیم یونانی نظامِ فکر میں عقل کا وظیفہ حسنِ مطلق کی تحصیل اور عشق کا وظیفہ اس کا قرب و وصال حاصل کرتا ہے۔

حسن ہی چونکہ قدیم یونانیوں کا مطمحِ نظر اور مقصودِ زندگی تھا اس لئے اس کی عملی صورت کو ''خیر'' اور اس کی تصدیق کو ''صداقت'' سمجھتے تھے اور ان تینوں یعنی ''حسن'' ''صداقت'' اور ''خیر'' کو ایک ہی حقیقت کے تین پہلو تسلیم کرتے تھے۔ یہ لوگ حسنِ مطلق کے وصال ہی میں جو ان کے نزدیک فنانی الذات کے مترادف تھا۔نجاتِ انسانی کو مضمر سمجھتے تھے یعنی اس دُنیا میں اگر حسن فطرت ان کا الہٰ یا معبود تھا تو آخرت میں بھی وہی ان کی نجات کا بحرِ مسرت تھا جس میں فنا ہو کر وہ خود بھی حسنِ مطلق بن جانا چاہتے تھے۔

سقراط (Socrates 469-399 B.C.) یونانی فلسفی حسن کے متعلق لکھتا ہے کہ جس نے حسین اشیاء کو ان کے صحیح نظم وضبط اور ترتیب میں دیکھنا سیکھ لیا ہے، وہ مفتی کے قریب پہنچے گا تو دفعتاً اس کی نظریں حسن کے ایک حیرت انگیز عالم سے دوچار ہو جائیں گی

یہ حسن ایسا ہے جسے ترقی ہے نہ تنزل، جو نہ تو بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے اور وہ ایسا بھی نہیں کہ ایک نقطہ ءنظر سے اچھا اور دوسرے سے برا ہو وہ چہرے، ہاتھ یا وجود کے کسی عضو کے مشابہ بھی نہیں۔ وہ بیان یا علم کی کسی صورت میں بھی نہیں اور اس کی ہستی کسی دوسرے وجود میں بھی نہیں لیکن صرف مطلق، بے نیاز، سادہ اور قیوم حُسن ہے جو کسی کمی یا زیادتی یا کسی تبدیلی کے بغیر دوسری تمام چیزوں کے بڑھنے اور فنا ہونے والے حسن میں ظاہر ہوتا ہے۔ صرف ایسا ہی شخص اس دُنیا کے ہر پیکرِ حسن کو وسیلے یا زینے کے طور پر استعمال کرسکتا ہے اور اس کے ذریعے حسنِ مطلق کی خاطر اوپر چڑھتا ہے۔ وہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تمام حسین صورتوں کی طرف اور حسین اعمال کی طرف اور حسنِ مطلق کے تصورات تک پہنچ جاتا ہے اور انجام کار حسن کی ماہیت سے آ گاہی حاصل کر لیتا ہے (Plato: Five dialogues Symposium P.53) سقراط کے اس بیان سے مفصلہ ذیل نتائج بآسانی مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) حسنِ مطلق ہی اصل حقیقت ہے اور جن چیزوں کو ہم خوب صورت کہتے ہیں وہ اس حقیقت کے مظاہر ہیں۔

(۲) حسنِ مطلق قائم بالذات، نا قابلِ تغیر، حی و قیوم ہے اور بے دخل اور بے عدیل ہے۔

(۳) حسنِ مطلق ہی تمام محاسن اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔

(۴) حسنِ مطلق کے مشاہدہ وادراک کا نام ہی علم ہے۔ یہ علم خیر ہے اور یہی حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی ہے۔

سقراط کے فلسفے کا حاصل ''حسن'' ہے جسے وہ غایتِ زندگی اور حاصلِ زندگانی سمجھتا ہے، اسکے نزدیک مردِ کامل کی پہچان یہ ہے کہ اُسکے قول وفعل میں حسن ہوتا ہے، اس کے تصورات حسین ہوتے ہیں اور اُسے حسنِ مطلق کا عرفان ہوتا ہے۔

افلاطون(Plato: 427-347 BC) یونانی فلسفی حسن کو انسان کی طلب وجستجو کا مقصود اس کی نظر و فکر کا مرکز اور حیاتِ انسانی کی غایت سمجھتا اور اس کی محبت ومعرفت کو علم وفلسفہ کا حاصل خیال کرتا

ہے۔(افلاطون کا فلسفہء غائیت Teleology)(مراد غایت یا مقصد)

سقراط نے خدا کی ہستی یا ذاتِ الٰہی کو ''اگاتھوس'' (agathos) یعنی ''الخیر'' کہا تھا، جو سرتا سر اچھائی اور حسن ہے۔ حسنِ مطلق کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ ایک حسیت پسند شخص کے لئے انصاف اور خیر کی طرح حسن بھی ایک صفت ہے جسے ہم فکر میں اشیائے محسوس سے مجرد کر لیتے ہیں اور ان اشیاء سے الگ اس کی اپنی کوئی ہستی ہی نہیں ہوتی۔ افلاطون کے نزدیک حسن ایک ہستی ہے یہ صرف حقیقی ہی نہیں بلکہ تمام جہان کی خوبصورت چیزوں کو ملا کر بھی اسکی حقیقت ان سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ جس شئے کو ثبات ہے وہ اس شئے کی بہ نسبت ہے جسے ثبات نہیں یا جو تغیر پذیر سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر حسین شئے خواہ وہ انسان ہو یا تمثیم، فرد ہو یا کوئی فعل حادث ہے اور وہ کبھی نہ کبھی ضرور فنا ہو جائے گی لیکن حسن بذاتِ خود ''حقیقی'' ہے۔ انسان کا نوعی تصور کسی فرد کی بہ نسبت بہت زیادہ حقیقی ہے، کیونکہ قائم بالذات ہے اور اُسے فنا نہیں (Symposium P211)

افلاطون کے نزدیک حسن نیکی (حسنہ یا خیر) کا عین ہے اور عالمِ محسوس میں اس کے مظاہر صرف اضافی حسن رکھتے ہیں، یعنی کم حسین اشیاء کے مقابلے میں ان کا اظہار ہوتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کا اس سے زیادہ خوبصورت شئے کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو پہلی شئے ہمیں خوبصورت معلوم نہیں ہوتی ایک شخص کے لئے ایک خاص نقطہء نظر سے ایک خاص تعلق میں ایک خاص مقام پر ایک چیز خوبصورت بن جاتی ہے۔ لہذا آثار و حوادث کی اس دُنیا میں ہر حسین شئے اضافی، گریز پا اور غیر یقینی ہے۔ صرف حسنِ اعیانی یا تصوری ایک قائم بالذات شئے ہے، جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام، نہ اسے زوال ہے نہ انحطاط، یہ غیر معتبدل، غیر متغیر اور مطلق ہے، یہ ہر تعلق اور ہر نقطہء نظر سے خوبصورت ہے، یہ ہر زبان میں، ہر مکان میں اور ہر شخص کے لئے حسین ہے، یہ ہر عیب سے منزہ اور تخیل کی قوتوں سے ماورا ہے۔ یہ نہ تو مفہومِ محض ہے نہ انفرادی علم ہے بلکہ سرمدی حقیقت ہے وہ کہتا ہے کہ ایک فلسفی محض حسن سے محبت رکھتا ہے وہ شخص جو صرف خوبصورت چیزوں کو چاہتا ہے خوابیدہ ہے،

حالانکہ وہ شخص جسے حسنِ مطلق کی معرفت ہے بیدار ہے۔ پہلے شخص کی محض رائے یا قیاس ہے، مگر دوسرے شخص کو علم ہوتا ہے (Plato: Republic Book x Passium)

افلاطون حسن، نیکی اور عقل کو حقیقت ہی کے ایک سلسے کی تین کڑیاں تصور کرتا ہے اور غایتِ زندگی کو حسن مطلق کے مشاہدے میں مضمر سمجھتا ہے

افلاطون کے نزدیک حسن کی بھی دو قسمیں ہیں۔

اوّل: محسوسات کا حسن جو خارجی اور بے ثبات ہے۔ اس سے حسّی لذت تو حاصل ہوتی ہے مگر یہ قلب کو تاریک کر دیتی ہے۔ قلب کی یہ تاریکی عقل کو بھی گمراہ کر دیتی ہے جس سے حیاتِ انسانی خوف وحزن کا شکار ہو کر اپنی راہ ومنزل سے بھٹک جاتی ہے۔

دوم: اعیان یا حقائق چانیہ کے عالم کا حسن جو رنگِ ثبات سے مزین ہے اور یہی وہ حسن ہے جو نیکی وروحانی مسرت کا سرچشمہ ہے اس سے عقل میں سلامتی اور نور پیدا اس ہوتا ہے جس سے انسان اپنی منزلِ مقصود کو پالیتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک حسن بے شک حیاتی اور باطنی خوشیوں کا منبع ہے، لیکن وہ صرف ان خوشیوں کو مقصودِ زندگی سمجھتا ہے جو پاکیزہ ہیں اور یہ فقط حسنِ قلب ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔

افلاطونس (Platinus 204-270 B.C.) کو افلاطینس، پلوطینس اور پلوٹینس بھی کہتے ہیں یہ مصؔر میں پیدا ہوا اور رومؔ میں راہی ملکِ عدم ہوا۔ وہ فلسفہ اشراق کا بانی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''حسن تناسب وہم آہنگی کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جو چیزوں کے تناسب وہم آہنگی کے اوپر چمکتا ہے اور اسی پر ان کی دلکشی ونظر افروزی کا انحصار ہے اگر اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ حسن کا نور زندہ چہروں پر تو ہوتا ہے مگر مردہ چہرے پر اس کا شائبہ ہی ہوتا ہے، گو اس کی صورت عناصرِ ترکیبی کے تناسب وہم آہنگی کے لحاظ سے ابھی خراب بھی نہ ہوئی ہو۔ اگر یہ نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ مجسمے جو زندگی سے معمور معلوم ہوتے ہیں ان مجسموں کے مقابلے میں زیادہ

خوبصورت ثابت ہوتے ہیں جن میں سے ان سے اعضا کے تناسب وہم آہنگی کے باوصف زندگی اپنی نمونہیں رکھتی؟ اور ایسا کیوں ہے کہ ایک بدصورت مگر زندہ شخص، کسی حسین شخص کے، مجسمے سے زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے؟ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ زندہ حسن بے جان حسن سے زیادہ پسندیدہ وقرۃُ العین اور محبوب ومطلوب ہوتا ہے۔

پھر لکھتا ہے" وہ جو کسی شئے کو دیکھتا ہے اسے اس شئے سے ناظر رکھنے والا اور اسی جیسا ہو جانا چاہیئے پیشتر اس سے کہ وہ اسے دیکھ سکے آنکھ سورج کو کبھی نہ دیکھ سکتی اگر وہ سورج کی بن نہ گئی ہوتی۔ قلب حسن کو کبھی نہ دیکھ سکتا اگر وہ پہلے خود حسن نہ بن گیا ہوتا۔ ہر شخص کو پہلے فطرتِ الٰہی میں شریک ہونا چاہیئے پیشتر اس سے کہ وہ الوہیتی حسن کا مشاہدہ کر سکے۔ اس کی مزید تشریح اس طرح کرتا ہے" جس نفس میں حسن کا نور نہیں ہوتا اس میں خدا تعالیٰ کا جلوہ بھی نہیں ہوتا چنانچہ وہی نفس جو نور سے منور ہوتا ہے اپنی طلب وجستجو کے مقصود کو حاصل کر لیتا ہے اور نفس کا مقصود نورِ حسن کو ہی حاصل کرنا اور خدا تعالیٰ کو صرف خدا تعالیٰ کے ذریعے دیکھنا ہے کسی اور اصل کی روشنی یا ذریعے سے نہیں اور یہ اُس خدا تعالیٰ کو دیکھنا ہی تو ہے جو اپنے شہود یا بصیرت کا ذریعہ بھی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جو نور روح کو منور کرتا ہے وہی تو ہے جسے جاتا ہے جیسا کہ ہم سورج کو اسی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس حسن کی جلوہ گاہ میں افلاطونس کے نزدیک حسن ہی مقصودِ زندگی ہے اور یہ مقصود حسن مطلق کے مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے اور اس مشاہدے کا ذریعہ قلب ہے لیکن وہی قلب جو پاکیزہ اور حسین ہو۔

"ہر وہ شئے جو قلب کو پاک وصاف کرتی اور رفعت بخشتی ہے مقصودِ حقیقی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے چنانچہ انسان ان ہی راستوں سے اپنی آخری منزلِ مقصود یعنی عالمِ الوہیت تک پہنچ سکتا ہے۔

افلاطونس بار بار اپنے اس نظریے کو مختلف اسلوب میں دہراتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود

حسن ونور بھی ہے اور حسن کا سرچشمہ بھی اور انسان حسن الٰہی کا مشاہدہ فقط اپنے حسنِ باطنی کے نور ہی سے کرسکتا ہے۔ مشاہدہء الٰہی سے اوپر ایک منزل بھی ہے جو انسان کی آخری منزلِ مقصود ہے اور وہ حضوری ووصال کی منزل ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان کو جو وجد آفریں کیف وسرور ملتا ہے وہی حقیقت میں حاصلِ زندگانی ہے" انسان اپنی منزلِ مقصود پر اس وقت ہی پہنچتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے وصال کی وجد انگیز مُسرت میں اسکی روح اپنی انفرادیت اور سرگرمیِ حیات سبھی کچھ کھو دیتی ہے۔ یہ ہے روح کا حقیقی مقصود، جس کے حصول کے لئے انسان کو پہلے اپنے نورِ حسن سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے پھر اس نورِ حسن کے ذریعے حسنِ مطلق کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ افلاطونس غناسطیوں کے اس متصوفانہ نظریے کا معترف تھا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ، فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ یعنی جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

آیئے اپنے خالق یعنی محبوبِ حقیقی کو پہچانیں اور اُسی کے حسنِ الٰہی میں گم ہو جائیں۔ انسان کے لئے وصلِ حقیقی ہی سب سے افضل واعلیٰ برکت ہے۔

(ماخوذ از تاریخ جمالیات حصہ اوّل از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر)

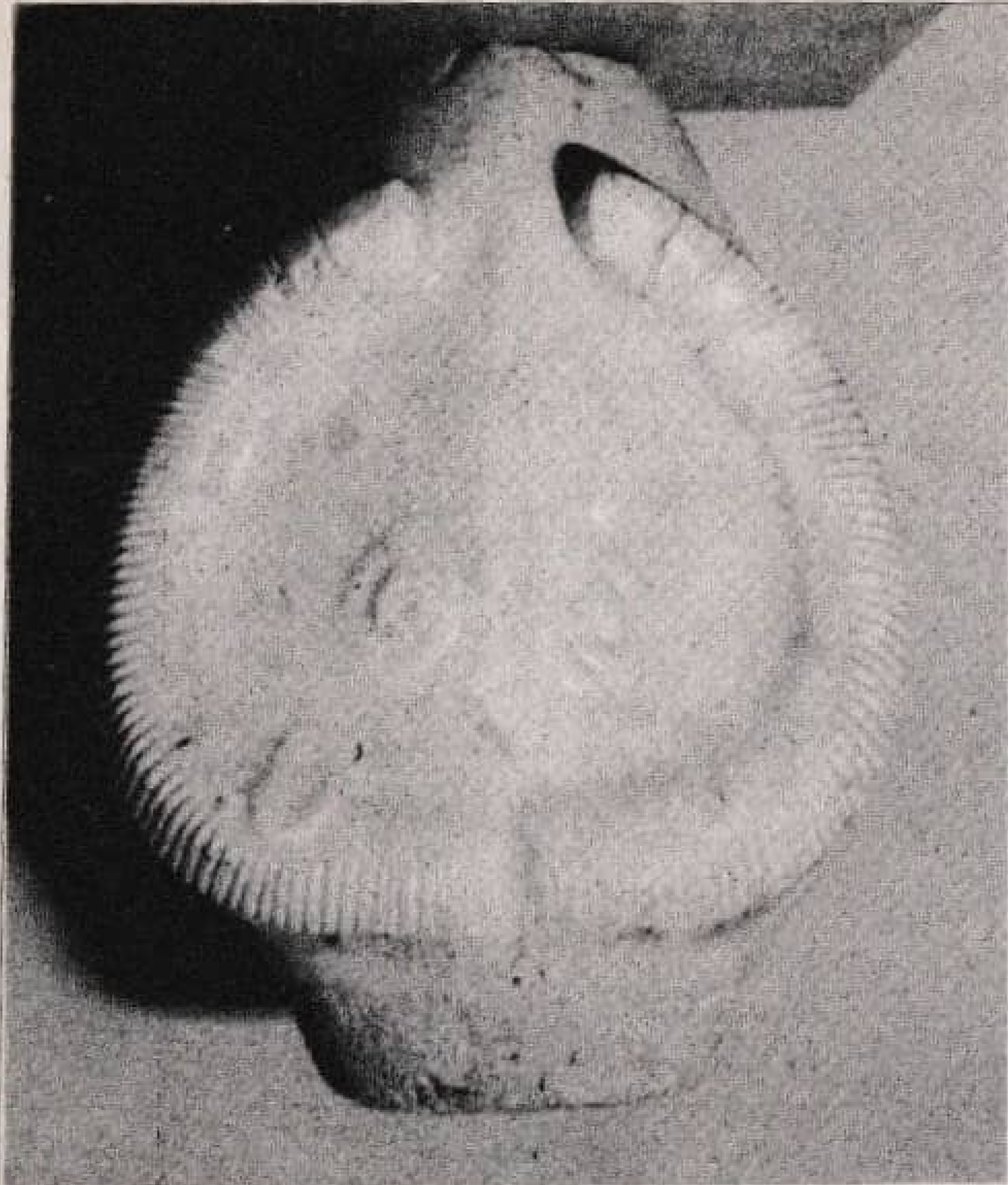
Abraham's travels

ابراہامؑ کا کنعان کی جانب سفرِ مبارک

Abraham came from Ur to Harran and then south-west to Canaan, the land God promised to give to him and his descendants. He spent most of his life in Canaan based near Hebron, apart from a brief visit to Egypt at a time of famine. But he never owned the land. When his wife Sarah died he had to buy ground from a Hittite in order to bury her.



کوہِ کلوری ، جہاں ازلی برّہ مصلوب ہوا



برّہ کے سر کا Portrayal جو ACana, ترکی میں دریافت ہوا
کہا جاتا ہے کہ یہ تقریباً ابراہام کی وقت سے متعلق ہے